یکم مئی ۱۹۷۱ء

ہفتہ وار

ہماری زبان

جلد ۲۹ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | شمارہ ۱۷

اس شمارے میں

آل احمد سرور

اردو تحریک — ایک ذاتی جائزہ

ہندوستان نے ایک جمہوری طرز حکومت کو اپنایا ہے جمہوری طرز حکومت میں خوبیاں بھی ہیں اور خامیاں بھی۔ اگر اکثریت کا اخلاقی معیار بلند نہیں ہے تو وہ اقلیت پر جبر بھی کرتی ہے اور قومی مسائل کو ووٹوں کی کثرت سے طے کرنا چاہتی ہے۔ اگر اخلاقی معیار بلند ہے تو وہ اقلیتوں کے مسائل کا لحاظ رکھتی ہے ان کی بے اطمینانی دور کرنا چاہتی ہے اور ان کے خطروں اور وسوسوں کو سمجھ کر ان کی حقیقی مشکلات کو دور کرنا، اپنا فرض سمجھتی ہے۔ اس طرح اقلیت کے بھی کچھ فرائض ہوتے ہیں۔ ایک طرف وہ ملک کی مجموعی ترقی میں حارج نہیں ہوتی، دوسرے وہ اکثریت کو بات بات میں چیلنج نہیں کرتی، اس کے ذہن کو سمجھنے اور بدلنے کی کوشش کرتی ہے تیسرے وہ ملک کی مجموعی فضا، اس کی تاریخ، تہذیب روایات، ضروریات کو اپنانے کی کوشش اس حد تک ضرور کرتی ہے جس حد تک اس کا اپنا وجود اور اس کی خصوصی روایات فنا نہ ہو جائیں۔ یہ بات کہنا اور ماننا آسان ہے، اس کا برتنا مشکل ہے، مگر تاریخ اور دنیا کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اسی راستے پر چل کر ہم ترقی کر سکتے ہیں اور اپنے ملک کو تہذیب و انسانیت کا گہوارہ بنا سکتے ہیں۔

اردو کے سلسلے میں آزادی کے بعد سے تقسیم کے پیدا کردہ مسائل کی وجہ سے انصاف نہیں ہوا ہے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے اور کسی قسم کی لیپ پوت سے اس حقیقت کو کوئی اور رنگ نہیں دیا جا سکتا۔ ایک دوسری حقیقت یہ بھی ہے کہ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ہے، اردو کی قومی حیثیت کا اعتراف بڑھتا گیا ہے اور اس کے ساتھ انصاف کا جذبہ بھی ابھر رہا ہے اور انصاف کی کوشش بھی ہے گو عمل کے معاملے میں ابھی بہت کم تبدیلی ہوئی ہے، ایک تیسری حقیقت یہ بھی ہے کہ جمہوریت میں عمل چونکہ صرف اوپر والوں کی نیت پر منحصر نہیں بلکہ اس میں مرکز کے با اختیار اشخاص سے لیکر ضلع بلکہ تحصیل کے درجے تک ہر قسم کے کارکن اور قومی زندگی کو چلانے والے ہر طرح کے لوگ آتے ہیں، اس لئے اوپر کے احکام کتنے ہی دل خوش کن کیوں نہ ہوں، جب تک انتظامیہ کی اصلاح نہیں ہوتی اور پروگراموں کو پورا کرنے کے سلسلے میں احتساب نہیں ہوتا، دشواریاں باقی رہتی ہیں اور شکایات کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے، ایک چوتھی حقیقت یہ ہے کہ اس صورت حال کی وجہ سے قدرتی طور پر نیک نیت مگر محدود نظر رکھنے والے حضرات بعض اوقات اتنے مایوس ہو جاتے ہیں کہ وہ صرف راست اقدام بڑے پیمانے پر جدوجہد، موجودہ نظام کو سرے سے اکھاڑ پھینکنے کی سوچنے لگتے ہیں، پانچویں حقیقت یہ ہے کہ چونکہ گزشتہ دس سال میں لوگوں کا مزاج بہت بدلا ہے اور بہت سی باتیں جو اب تک لوگ کسی نہ کسی طرح برداشت کرتے آ رہے تھے، ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہیں، اس لئے ہر قسم کا انتہا پسند

اشاعت کی تاریخیں ۱، ۸، ۱۵، ۲۲

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

فی پرچہ: ۱۵ پیسے
قیمت سالانہ: ۵ روپے

پروگرام زیادہ مقبول ہوتا ہے، تیسری پروگرام جس میں سبھی کو کچھ نہ کچھ کرنا ہوتا ہے، اتنے مقبول نہیں ہوتے، چھٹی حقیقت یہ ہے کہ ہماری جمہوریت پارٹی سسٹم پر چل رہی ہے، ہر پارٹی اقتدار حاصل کرنا چاہتی ہے اس پر غور کم کرتی ہے کہ اقتدار کس مقصد کے لئے حاصل کرنا ہے اور اس اقتدار کو کس طرح مجموعی فلاح کے لئے استعمال کرنا ہے، ساتویں حقیقت یہ ہے کہ لوگ اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے، بلکہ حکومت کو ایک ماں اور اپنے کو ایک بچہ سمجھتے ہیں، جس طرح ماں بچے کی ہر خواہش کا خیال رکھتی ہے اور ہر ضرورت خود بخود پوری کرتی ہے، اس طرح لوگ بھی حکومت سے ہر بات کی توقع رکھتے ہیں اور پھر بھی یہ چاہتے ہیں کہ حکومت ان کی آزادی میں کسی طرح خلل انداز نہ ہو۔

کچھ لوگ ہندوستان کے جمہوری نظام کی خرابیوں کو ہی دیکھتے ہیں، وہ پیمانہ یہ مقرر کرتے ہیں کہ ہمیں کیا ملا۔ اس میں بھی حقیقی ضرورت سے زیادہ ہمسائے کے معیار کا خیال ہوا کرتا ہے، ایک چھوٹی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو ذاتی یا سیاسی مقاصد کے تحت ملک میں ہر طرح خیریت سمجھتے ہیں اور ہر قسم کی بے اطمینانی کو خواہ وہ کتنی ہی حقیقی کیوں نہ ہو بے جا سمجھتے ہیں، یہ دونوں گروہ غلطی پر ہیں۔ آج کی حقیقت سیاہ اور سفید رنگوں کی نہیں ہے، اس میں دونوں رنگ ملے ہوئے ہیں یہ ایک مجموعی چت کبری کئی رنگوں کی حقیقت ہے۔ ہمیں اس حقیقت سے آنکھیں چار کرنا ہیں۔

اردو کی بقا اور ترقی اردو والوں کی صلاحیت، ان کی کوشش اور ان کی مستقل مزاجی سے وابستہ ہے۔ یہ ایک دن یا ایک سال یا دس سال میں حل ہونے والا مسئلہ نہیں ہے اور نہ ایسا مسئلہ ہے جس کے لئے ہم ابد تک انتظار کرتے رہیں۔ اس کے لئے تین باتیں ہمیں ساتھ ساتھ کرنا ہیں، ایک تو اپنی کوشش، دوسری اکثریت کو اس بات کا قائل کرنا کہ لسانی اقلیتوں کے اطمینان میں ہی بالآخر اکثریت اور ملک وقوم کی فلاح ہے، تیسرے، ہر سطح اور ہر ادارے کے اچھے کام کو سراہنا اور تقسیم کار کے اصول کار پر عمل کرنا تاکہ عمل صلاحیتیں آپس میں ٹکرا کر ضائع نہ ہوں۔ یہ بات مشکل ہے، مگر ہے ضروری۔ اس اجمال کی تفصیل اگلی اشاعت میں ملے گی۔ (باقی)

اردو کے ممتاز ادیب شاعر اور نقاد علامہ اختر علی تلہری کی وفات

لکھنؤ ۱۸ اپریل اردو کے ممتاز اور صاحب طرز ادیب، شاعر، نقاد اور محقق علامہ اختر علی تلہری ایک طویل علالت کے بعد آج صبح بلرام پور اسپتال کے وارڈ نمبر ۲ میں وفات پاگئے وفات کے وقت ان کی عمر ۷۰ سال تھی۔ مولانا اختر علی تلہری گذشتہ ایک سال سے صاحب فراش تھے اور پچھلے سال اسی زمانہ میں ایک قلبی دورہ کے بعد بلرام پور اسپتال میں داخل کئے گئے ان کے ٹیومر ہوگیا تھا بعد میں کینسر کی شکل اختیار کرگیا جو جان لیوا ثابت ہوا۔

مرحوم کے پسماندگان میں ان کی بیوہ دو صاحبزادے اور ایک صاحبزادی ہیں۔ • سیاست

"صبح" کا آزاد نمبر شایع ہوگیا

مرتب: عبداللطیف اعظمی

سہ ماہی "صبح" کا جو انجمن ترقی اردو شاخ دہلی کا ترجمان ہے، مولانا ابوالکلام آزاد نمبر شائع ہوگیا ہے، جس میں اردو کے مشہور ادیبوں کے مضامین شامل ہیں، مثلاً ڈاکٹر سید عابد حسین، خواجہ غلام السیدین، پروفیسر آل احمد سرور، جناب مالک رام، جناب عتیق صدیقی، مولانا عبدالماجد دریا بادی وغیرہ۔

حجم دو سو صفحات، قیمت ساڑھے تین روپے۔ ملنے کا پتہ: جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو۔ علی منزل کوچہ چیلان دہلی ۶

• عبداللطیف اعظمی

"صبح" کا روش صدیقی نمبر

سہ ماہی "صبح" کا، جو انجمن ترقی اردو شاخ دہلی کا ترجمان ہے، جولائی میں روش صدیقی نمبر شایع ہوگا، جس میں مرحوم کے حالات زندگی اور ان کی شاعری پر مضامین اور ان کے کلام کا نمائندہ انتخاب شامل ہوگا۔ اصحاب قلم سے درخواست ہے کہ مرحوم کی شخصیت اور ان کی شاعری پر آخر مئی تک حسب ذیل پتے پر مضامین ارسال فرما کر اس نمبر کو کامیاب بنائیں:۔

عبداللطیف اعظمی، ایڈیٹر سہ ماہی "صبح"
دفتر شیخ الجامعہ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

تصحیح

۱۵ اپریل کے ہماری زبان میں اردو مصنفین کو انعامات کے تحت جو خبر چھپی ہے اس میں پہلا انعام جناب امام مرتضیٰ نقوی اور دوسرا جناب ڈاکٹر انوار الحسن کو ملا ہے۔ قارئین ہماری زبان نوٹ فرمالیں۔ (ادارہ)

ہماری زبان
سے خط وکتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر حوالہ ضرور دیں۔ (ادارہ)

ڈاکٹر محمد انصار اللہ

بکٹ کہانی کا مصنف

افضل غازیپوری تھا؟

اردو اور فارسی کے تذکروں میں محمد افضل نام کے ایک سے زائد شعرا کا ذکر ملتا ہے۔ میں نے اپنے ایک مراسلے میں اہل علم حضرات سے درخواست کی تھی کہ یہ بات قطعی طور پر متعین کردی جائے کہ "بکٹ کہانی" کا مصنف ان میں سے کون سا محمد افضل ہے (ہماری زبان یکم اپریل ۱۹۹۱ء)۔ اب اپنی بات کی مزید وضاحت کے لیے چند ضروری امور کی نشاندہی کرتا ہوں اس توقع کے ساتھ کہ ان امور پر کما حقہ غور کیا جائے گا اور اس تصنیف کے متعلق بعض بنیادی مسائل حل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

"بکٹ کہانی" کے مصنف کے حالات کے سلسلے میں جن مآخذ سے استفادہ کیا گیا ہے وہ تین قسم کے ہیں۔

اول شعرائے فارسی کے تذکرے   دوم شعرائے اردو کے تذکرے

سوم بکٹ کہانی کے مخطوطات

ایک مآخذ جو ایک مقصد کے لیے نہایت اہم ہوسکتا ہے ہرگز ضروری نہیں کہ دوسرے مقصد کے لیے بھی اتنا ہی اہم ثابت ہو، اسی طرح ایک ذریعہ جو ایک نقطۂ نظر سے نہایت غیر اہم ہو عین ممکن ہے کہ کسی دوسری ضرورت کے لیے بہت زیادہ اہمیت حاصل کرلے اس لیے مناسب یہ ہے کہ "بکٹ کہانی" کے نقطۂ نظر سے بھی ان مآخذ کی اہمیت پر نگاہ کرلی جائے۔ اتنی بات مسلم ہے کہ "بکٹ کہانی" زبان ریختہ میں لکھی گئی، فارسی کے تذکرہ نویسوں کے لیے اس کی اہمیت نہ ہونے کے برابر تھی، چنانچہ کسی ایک تذکرۂ فارسی میں بھی "بکٹ کہانی" کا صراحت کے ساتھ ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ محمد افضل نام کے ایک سے زائد شاعروں کا وہاں ذکر ملتا ہے جو مختلف زمانوں اور علاقوں سے متعلق ہیں، ان میں ایک سے زائد ایسے بھی ہیں جن کی بابت یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ وہ زبان ریختہ کے شاعر بھی رہے ہوں گے۔ ان میں سے کسی ایک کو "بکٹ کہانی" کا مصنف قیاس کرکے اس کے معاملات اور واقعات کو مصنف "بکٹ کہانی" سے متعلق کرنا اور ان معاملات و واقعات کے پس منظر میں "بکٹ کہانی" سے بحث کرنا، تاوقتیکہ اس قیاس کے لیے قطعی شہادت موجود نہ ہو گمراہ کن ہی ہوگا۔

ریختہ گو شاعروں کے حالات میں شعرائے اردو کے تذکروں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن "بکٹ کہانی" کے بارے میں ان تذکروں کی شہادتیں بہت واضح نہیں ہیں مثلاً میر حسن نے اس کتاب کے مصنف کے مسکن اور زمانہ دونوں کا ذکر نہیں کیا، قائم کے الفاظ سے اگرچہ یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید وہ مصنف بکٹ کہانی کا زمانہ "عہد عبداللہ قطب شاہ" سے پہلے کا سمجھتے تھے لیکن اس کے برعکس قرائن بھی موجود ہیں، اسی طرح ان کے تذکرے کے ایک مخطوطے میں اس کو "از سکان جھنجھانہ" اور دوسرے میں "از سکان دیار مشرق" لکھا ہوا ہے[۱] چنانچہ یہ طے کرنا کہ اس میں سے صحیح کون سی بات ہے، تاوقتیکہ کوئی اور شہادت موجود نہ ہو ممکن نہیں۔ اس موقع پر یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ قائم اور میر حسن دونوں اس بات کے مدعی نہیں ہیں کہ انھوں نے "بکٹ کہانی" خود دیکھی تھی، اس کتاب اور اس کتاب کے مصنف کے بارے میں جو روایات مشہور تھیں اغلب ہے کہ دونوں کے بیانات انھیں پر مبنی ہیں، قائم اور میر حسن کے عہد تک "بکٹ کہانی" کی تصنیف کو بہت کافی زمانہ گزر چکا تھا (موجودہ مفروضات کے مطابق ایک صدی سے بھی زائد) اس لیے بھی ان تذکرہ نویسوں کے بیان پر پورے طور سے اعتماد کرلینا مناسب نہیں، بہتر دلائل اور زیادہ معتبر شہادتوں کی جستجو لازم ہے۔

"بکٹ کہانی" کے مخطوطات کی بابت ہمیں بتایا گیا ہے کہ

> "یہ تمام شمال تا دکن مختلف علاقوں کے کاتبوں کے لکھے ہوئے ہیں اس لیے ایک ہی لفظ کی مختلف بولیوں (دکنی، برج بھاشا، کھڑی، ہریانی) کے زیر اثر مختلف شکلیں لکھی گئی ہیں" (مقدمہ ص ۲۹)

ایسی صورت میں مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہوکر رہ گیا ہے اور کسی ایک مخطوطے کے لسانیاتی تجزیہ سے بھی یہ اندازہ نہیں کیا جاسکتا کہ مصنف کس علاقے سے تعلق رکھتا تھا۔ البتہ مخطوطات کی نوعیت، ان کے مختلف اندراجات وغیرہ پر غور کیا جانا چاہیے۔ مطبوعہ "بکٹ کہانی" کے مرتبین نے کتاب کے نو قلمی نسخوں کا مختصراً تعارف کرایا ہے، پروفیسر مسعود حسین خاں کا کہنا ہے کہ:

> "صرف تین نسخوں پر سنہ کتابت درج ہے۔ اس اعتبار سے قدیم ترین نسخہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کا ہے جس کا سنہ کتابت سنہ ۱۲۲۰ھ ہے اور جو موجودہ متن کے سلسلے میں نمبر ۹ قرار دیا گیا ہے۔ دوسرا نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن کی ملکیت ہے اس پر سنہ ۱۲۴۵ھ تاریخ کتابت درج ہے اور یہ موجودہ متن کے سلسلہ کا نمبر ۱ ہے۔ تیسرا نسخہ نمبر ۲ ہے جس کا سنہ کتابت سنہ ۱۲۶۹ھ ہے۔"

۱؎ اس بارے میں امکان دو ہیں اول یہ کہ نقل الاصل قائم نے "از سکان دیار مشرق" لکھا ہو، ثانیاً یہ کاتب کی اصلاح ہو، دوسری صورت میں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ کاتب کو اپنی معلومات پر بہت اعتماد تھا چنانچہ تصرف کے باوجود اس کی اہمیت کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں بعینہٖ یہی صورت جھنجھانہ والی روایت کی بھی ہے اس لیے قطعی حکم لگانے سے پہلے دوسری شہادت تلاش کرنا ضروری ہے۔

نسخہ نمبر ۵ کی بابت موصوف نے جو فرمایا ہے یہ ہے:

"اس پر ۱۲۳۶ھ یوم جمعہ "تاریخ کتابت پڑی ہے
چونکہ اس کا کاتب کھڑی بولی کے علاقے ضلع میرٹھ
میں گڑھ مکتیشر کا متوطن ہے اس لئے وہ اس بولی کے
تلفظ کی صحت کا التزام رکھتا ہے یہ نسخہ نہ صرف
سب سے قدیم ہے بلکہ سب سے مستند بھی کہا جا سکتا
ہے اس میں دوہرے وغیرہ مطلق نہیں ملتے شاعر
اپنے تخلص افضل کو دو جگہ استعمال کرتا ہے آخری
شعر اور اس سے پہلے شعر میں"

یہ بات مستقین نہیں ہے کہ مصنف کھڑی بولی کے علاقے کا رہنے والا ہے۔ پروفیسر موصوف نے لسانیاتی تجزیہ کے بعد جن بولیوں کے اثرات کی نشاندہی کی ہے وہ برج بھاشا اودھی، دکنی اور پنجابی ہیں، ایک جگہ موصوف ہی نے یہ بھی لکھا ہے:

"یا سے مرکب ماضی کی مثالیں (رہیا، کھیا) جو
ہریانی، دکنی اور کھڑی کی خصوصیت ہے بارہ ماسہ
میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی" (مقدمہ ص۲۵)

ایسی صورت میں اس نسخہ میں کھڑی بولی کے اثرات کو "تلفظ کی صحت کا التزام" کہنا مناسب نہیں اور چنانچہ اس نسخے کو مستند کہنا بھی مشکل ہے۔ یہ بات کہ اس نسخے کے آخری دو شعروں میں شاعر کا تخلص آیا ہے بجائے خود شک کا سبب ہے۔ اس کی توثیق کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہوتی، دوسرے بعض نسخوں میں آخری سے پہلے شعر میں افضل کی جگہ "احقر" اور "آخر" ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ایک سے زائد شعروں میں اپنے تخلص کے نظم کرنے کی مثالیں کافی ملتی ہیں لیکن "بکٹ کہانی" میں بھی یہ صورت تھی یہ بات محتاج ثبوت ہے۔ کاتب کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ گڑھ مکتیشر کا رہنے والا تھا اس سے قیاس ہوتا ہے کہ شاید ترقیمہ میں اس نے یہ بات کہی ہوگی لیکن اس نے اغلب ہے کہ اپنا نام نہیں لکھا چھر کتابت کی تاریخ اور مہینہ بھی نہیں لکھا اس کے مقابلے میں نسخہ نمبر ۱ کے کاتب نے نسبتاً زیادہ معلومات فراہم کی ہیں۔ پروفیسر نور الحسن ہاشمی نے اس کا تعارف اس طور پر کرایا ہے:

"کاتب کم سواد ہے۔ بدخط مگر صاف ہے۔ ترقیمہ
یہ ہے" دستخط عبد الکریم برائے پاس خاطر خود و تشلیم[1]
ہر کس کہ دعوا کند باطل گردد سنہ ۱۲۴۵ھ ماہ سابان[2]
تاریخ بیست و پنجم روز شنبہ" کل اشعار کی تعداد
۲۵۱ ہے۔ اس میں کوئی جنتری دوہرا نہیں"

[1] ترقیمہ میں "تشلیم" صیغہ جمع متکلم لکھا ہے۔ پورب کے لوگ بالعموم اپنے سے جمع متکلم کی ضمیر "ہم" اب بھی استعمال کرتے ہیں برخلاف اس کے دہلی والے ضمیر واحد متکلم "میں" کہتے ہیں۔ اس سے نسخہ کے مقام کتابت کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ [2] اسی طرح شعبان کو سابان بھی پورب والوں کی بول چال ہے۔

اس نسخہ میں اشعار کی تعداد کم تر ہے، تعداد کم ہونے کی صورت میں یہ شبہ تو ہو سکتا ہے کہ شاید کاتب نے بعض شعر حذف کر دئے ہوں، الحاق کا امکان اس حذف کے پیش نظر کم سے کم رہ جاتا ہے۔ نسخہ نمبر ۹ میں اگرچہ صراحت کے ساتھ تعداد نہیں بتائی گئی لیکن قریب بہ یقین ہے کہ وہاں بہت زیادہ ہوگی۔ اسی بات کا مرتبین کو اعتراف ہے (ملاحظہ ہو "اختلاف نسخ") کہ نسخہ نمبر ۹ کے کاتب نے اشعار کی ترتیب میں رد و بدل کی ہے اور بعض اوقات شعر کے مصرعوں کو بھی الٹ دیا ہے، یہ تمام امور صریحاً اس حقیقت پر دال ہیں کہ نسخہ نمبر ۹ کی بابت یہ دعویٰ کرنا خلاف واقعہ ہے کہ وہ "مستند" ہے اور تصرفات سے پاک ہے، نسخہ نمبر ۱ کی بابت بھی پورے وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا لیکن اس کی موافقت میں چند امور ہیں اول یہ کہ اس میں بھی "دوہرا" وغیرہ نہیں ہے، دوم اس میں اشعار کی تعداد کم ہے یعنی اس میں الحاق کا امکان کم تر ہے، سوم کاتب نے روز و تاریخ و ماہ و سال کتابت کا ذکر صراحت سے کیا ہے اور چہارم یہ کہ یہ نسخہ اس نے خود اپنے لئے نقل کیا ہے۔ کتابت کا یہ سبب بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ کاتب خود شوقین تھا اس نے اپنی دلچسپی اور شوق کے لئے اسے کسی ایسے "ماخذ" سے نقل کیا ہوگا جو کم از کم اس کے خیال میں معتبر اور مستند تھا۔ اس نے نقل میں "تلفظ کی صحت کا التزام" کرنے کی اپنی علمیت کی حد تک ضرور کوشش کی ہوگی۔

پروفیسر ہاشمی صاحب نے کاتب کو "کم سواد" کہا ہے اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ اس نے دعویٰ کو "دعوا" اور شعبان کو "سابان" لکھا ہے۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ جس شخص کے شوق کا یہ حال ہو کہ پورا مخطوطہ نقل کرے اغلب ہے کہ وہ شعبان اور دعویٰ کے صحیح املا سے بھی واقف ہوگا۔ "بکٹ کہانی" کی زبان عوام کی بول چال کی زبان ہے، اسے پوری صحت کے ساتھ کاغذ کے سپرد کرنے کے لئے اصولاً "تلفظ کے مطابق املا اختیار کرنے کے سوا چارہ نہ تھا" اس سے بخوبی ممکن ہے کہ کاتب نے وہ املا عمداً اختیار کیا ہو جسے اس کی کم سوادی سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ نسخہ نمبر ۹ اور نسخہ نمبر ۱ کے مابین صرف پانچ سال کا فصل ہے، اور یہ اتنا نہیں کہ ایک مجہول کاتب کی نقل کی ترجیح کی بنیاد بن سکے۔

جن نسخوں پر سال کتابت تحریر نہیں ہے ان میں نسخہ نمبر ۲ خصوصیت سے قابل ذکر ہے پروفیسر ہاشمی نے اس کا بھی تعارف کرایا ہے:

"یہ رضا لائبریری رامپور کے نسخہ کی نقل ہے....
اس میں کوئی ترقیمہ نہیں، ابتدا میں صرف اتنا لکھا ہے
"بکٹ کہانی از محمد افضل کالپی" اشعار کی تعداد ۲۲۶
ہے۔ دوہرے یا فردیات مطلق نہیں"

دوہرے یا فردیات کا مطلق نہ ہونا، اشعار کی تعداد کا کم ہونا اس نسخہ میں الحاقی کلام کے کم تر ہونے یا تقریباً نہ ہونے کی دلیل ہو سکتی ہے۔

اس لحاظ سے اس نسخہ کے متن پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔ بظاہر یہ واحد مخطوطہ ہے جس میں اس کے مصنف کے مسکن کی طرف ایک اشارہ ملتا ہے۔ میں نے اپنے گزشتہ مراسلہ میں محمد افضل محقر کا ذکر کیا ہے جسے کالپی کے ایک بزرگ سے نسبت حاصل تھی۔ "بکٹ کہانی" کے مطالعہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ مصنف کو کسی نہ کسی طور پر تصوف سے بھی دلچسپی تھی ظاہرا اس سے غریب مصرعہ

گہے افضل گہے گوپال می باش

"من تو شدم تو من شدی" کی تفسیر ہے اور اس طور پر دیکھیں تو یہ میر حسن کی روایت کے مطابق بھی ہے۔ اس موقع پر یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ بکٹ کہانی کا وہ آخری شعر جس کو اس کے مصنف کے حالات کے تعین میں بہت اہمیت دی گئی ہے یعنی ؎

بہ یاد دلربا خوش حال می باش
گہے افضل گہے گوپال می باش

اس کتاب کے بعض نسخوں میں موجود بھی نہیں ہے چنانچہ مخطوطہ نمبر ۲ میں بھی نہیں ہے۔ ان تمام امور پر نگاہ کریں تو ظاہرا قیاس یہی کہتا ہے کہ تذکرہ قائم کی یہ روایت کہ محمد افضل "از سکان دیار مشرق" تھا درست ہے، میر حسن کا یہ بیان کہ وہ گوپال پر عاشق تھا صحیح ہے، نسخہ رامپور پر اس کا کالپی سے تعلق ظاہر کرنا بھی ایک حد تک واقعی ہے حالانکہ فی الاصل اس کا وطن بقول خوشگو غازی پور زمانیہ تھا اور بعد میں اس نے الہ آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی، فارسی میں اس کا تخلص محقر تھا لیکن اردو میں اس نے اپنے نام کے جزو کو ہی تخلص کے طور پر استعمال کیا ہے۔

"بکٹ کہانی" کے مقام تصنیف کے تعین میں ان موسمی کیفیات کا مطالعہ بھی معاون ہو سکتا ہے جن کا اس میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مطبوعہ "بکٹ کہانی" میں اشعار کی ترتیب کسی نہ کسی درجہ میں اصل سے مختلف ہو گئی ہے اس کے باوجود صحیح نتائج تک پہنچ جانا بہت مشکل نہیں ہے۔ ذیل میں "بکٹ کہانی" میں مذکورہ موسمی کیفیات کے مقابلے میں تین مختلف مقامات کی کیفیات پیش کی جاتی ہیں اول جائسی (بحوالہ ملک محمد جائسی[1]) دوم لکھنؤ (بحوالہ بارہ ماسہ مقصود[2] قلمی) اور سوم علاقہ بہار (بحوالہ بارہ ماسہ جوہری[3])

بیان ساون

بکٹ کہانی۔

چڑھا ساون بجا مارو نقارا   سجن بن کون ہے ساتھی ہمارا
گھٹا کاری چہاروں اور چھائی   - - - - - - - - - -
پپیہا پیو پیو نس دن پکارے   پکارے اور جھینگر جھنکارے
ارے جب کوک کوئل نے سنائی   تمامی تن بدن میں آگ لائی
اندھیری رات جگنو جھنکتا   - - - - - - - - - -
ہنڈولے جھولیں سب نار ہو نگ   - - - - - - - - - -

مقصود۔

چڑھا ساون لگی اڑنے بھنبھیری   نہ آئے کنت اچھوماتے سکھی ری

جائسی "ساون کے پانی سے کھیتوں میں بھرنی لگی۔۔۔۔ ۔۔۔۔ میرے آنسو زمین پر بیر بہوٹی کی طرح رینگتے پھرتے ہیں۔۔۔۔ سکھیوں نے اپنے شوہروں کے ساتھ ہنڈولا رچایا ہے۔۔۔۔۔ میرا دل بھنبھیری کی طرح بھٹکا پھرتا ہے"

جوہری

گھٹا ساون کی کاری جب پڑا جھوم   مرے پی بیچ پردیس آگیا دھوم
زمیں کوں ہے قبائے سبز دربر   سکھیں اپنے پیا سب میرے پی باہر

"بکٹ کہانی" میں ساون سے پہلے یعنی اساڑھ کے مہینے کی موسمی کیفیات کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، یہ مہینہ اس مصنف کی "برہن" کے وصل کا ہے، اس لئے برسات کے شروع کے حالات کا اندازہ نہیں ہو سکا۔ البتہ جن بعض امور کا ذکر "بکٹ کہانی" میں "ساون کے بیان" میں آگیا ہے، مقصود اور جائسی نے بھادوں کے مہینہ میں ان کا تذکرہ کیا ہے، اس بنا پر یہ خیال ہوتا ہے کہ بکٹ کہانی کا تعلق اور پورب سے ہے جہاں برسات کا موسم مغربی علاقوں کے مقابلے میں جلد تر شروع ہو جاتا ہے۔

بیان بھادوں

بکٹ کہانی۔

سیہ بادر چہاروں اور چھائے   لیا مجھ گھیر پیو ابھوں نہ آئے
جھڑی پڑنے لگی اور رعد گرجا   تمامی تن بدن جیو جان لرجا
گھٹا کاری کے اندر بیج چمکے   ڈرے جیو ڈر اکڑک سن دیہہ دھمکے
ادی نس دن بتا دو بوجھ ہاری   خبر پیو کی نہ پائی ہائے ماری
جری پرتی لیمن سب مرگئے ری   بھیاکت کاگ اور دھوکت رہے دل

مقصود۔

لگا یہ ماس اب بھادوں کا جالی   گھٹا چھوں اور چمک آئی ہیں کاری
اندھیری رات برسے مینہ گھنگھور   کرے ہے دادر اور جھینگر کا شور
پڑی ہے کان میں چھوں کی کوک   لگی ہے تن بدن میں عشق کی ہوک
سنائے ہے نس دن نام پیو کا   خدا حافظ ہے اس برہن کے جیو کا
چمکتی آن پر جگنو جو آئے   گویا بادود میں آتش لگائے

---

[1] ملک محمد جائسی مولفہ سید کلب مصطفے مطبوعہ ۱۹۴۱ء ص ۱۲۳ تا ص ۱۲۹۔

[2] مقصود کے متعلق اکثر تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ اس نے لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی، اس کے بارہ ماسہ کا ایک قلمی نسخہ حال ہی میں راقم سطور کو عزیز محترم مہر الٰہی صاحب کی عنایت سے دستیاب ہوا ہے۔ اس بارہ ماسہ کا پورا متن عنقریب شائع ہو رہا ہے۔

[3] بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا از پروفیسر اختر اورینوی ص ۲۵۲ تا ص ۲۵۷۔

کبھی جو کوک کوئل کی سنت ہوں   پیا کی یاد میں سر کو دھنت ہوں
سکھی گھر گھر بھی جھومیں بشد دے   برہنی رات دن جھنکے ہی دو دے

جائسی — "بھادوں کی کالی راتیں...... بجلی چمک کر اور بادل گرج کر ڈراتے ہیں، جب سگھا نکھتر سے مینہ برستا ہے تو میری آنکھیں اولتی کی طرح ٹپکتی ہیں۔"

کنوار کے مہینے میں برسات کا سلسلہ جاری رہتا ہے، دھیرے کا پوجنا اور اس موسم میں برہن کا فراق میں زیادہ پریشان ہونا سب جگہ مشترک ہے۔ البتہ کاتک کے مہینے سے موسم بدلنے لگتا ہے۔

بیان کاتک

بکٹ کہانی —

گئی برسات رت نکھرا فلک سب   نہی دو انم کو ساجن گھر پھریں کب
بھئی مجھ سیج بن پیو ناگنی رے   ستاوے دو مہینے رت چاندنی رے
دواری جاوت ہے گھر گھر و بازار   بھیا گلزار رانگے دیوری یار
ارمی اس دو دو سوں چلی کلکی رے   تمامی دیہہ برہانے دہی رے

مقصود —

لگا کاتک چلی رت سردی آئی   بنادیں لوگ سب تو شک رضائی
ہوا نرمل گگن جھلکی او رجاری   پیا بن سیج ہے سونی ہماری
ہوا اب دن بدن شروعات جاڑا   پیا بن دی ہے دکھ دن رات جاڑا
چلیں سکھیاں سبھی گنگا نہانے   پیا کے سنگ رت کاتک خانے
دوال کا جلا سب جگہ دیا ری   جگہ اوگوں سے ہیں روشن کیاری"

جائسی — "کاتک کی چاندنی کتنی ٹھنڈی ہے تمام عالم سرد ہے، ایک میں جل رہی ہوں...... سارے سنسار میں دیوالی کی دھوم مچی ہے۔"

جوہری — آئے کاتک کے ایسی دودھ کی رات
میں کہوا اودکے پکھن سن مری بات

کاتک کی چاندنی کا ذکر سب کے یہاں مشترک ہے۔ البتہ مقصود اور جائسی کے یہاں جاڑا شروع ہو گیا ہے جو بکٹ کے یہاں جاڑے کا ذکر نہیں ملتا، بکٹ کہانی میں بھی اس قسم کا کوئی اشارہ نہیں ہے۔ البتہ بکٹ کہانی میں اگہن کے مہینے میں "موسم خنک" ہوتا ہے، ظاہر ایسے مقام پر تصنیف ہوئی ہے جہاں برسات کا موسم لکھنؤ اور جائس کے مقابلے میں تا دیر باقی رہتا ہے، چنانچہ اس کے مابعد اثرات کا بھی یہی معاملہ ہے۔

بیان اگہن

بکٹ کہانی —

بھیا موسم خنک اسرنی بھی رے   اجھوں لگ عم اگن تن موں ہی رے

مقصود —

پڑے پالا بہت نس اوس برسے   پیا کے وصل کو جیرا یہ ترسے

جائسی — "اگہن کی بھاری راتیں بہت دشوار ہیں"

سے کٹتی ہیں...... دل سردی سے تھر تھراتا ہے"

پالا پڑنا اور جسم کو "تھر تھری" لگنا بھی بکٹ کہانی میں پوس کے مہینے میں مذکور ہے۔

بیان پوس

بکٹ کہانی —

پڑے پالا کرے تھر تھر مری دیہہ   سکھی کس بد گھڑی لاگا مرا نیہہ
کریں عشرت پیا سنگ ناریاں سب   میں ہی کانپوں اکیلی ہائے یارب
ارے لوگو میں کانوردیس جاؤں   سلونے شیام کو ڈھونڈ لاؤں

مقصود —

لگا یہ پوس دکھ دینے گھنیرا   کیا اجھوں نہ بالم آئے پھیرا

جائسی — "پوس کے جاڑے میں بدن تھر تھر کانپ رہا ہے، بستر گویا برف میں ڈوبا ہوا ہے"

بکٹ کہانی کی برہنی "کانوردیس" کا ارادہ ظاہر کرتی ہے اغلب ہے کہ وہ مقام نسبتاً پورب کی طرف ہوگا اور وہاں کی روایات میں کانوردیس کا ذکر عام ہوگا، راقم سطور کی معلومات کی حد تک اعظم گڑھ اور غازی پور وغیرہ اضلاع کے لوگ تلاش معاش میں دور دراز کے سفر پر اکثر جاتے رہے ہیں، جزائر جنوب تک بھی ان کے تجارتی سلسلے پھیلے ہوئے تھے۔ میر شیر علی افسوس نے بھی "آرائش محفل" میں کانوردیس کا ذکر کیا ہے — ماگھ کے مہینے تک جاڑا چلتا ہے، پھاگن سے پھر موسم بدلتا ہے۔

بیان پھاگن

بکٹ کہانی —

کہوں ڈھولک کہوں مردنگ باجے   کہوں سر منڈلا اور طنبورا گاجے
دھمالاں کرتیاں گھر گھر پھرتی ہیں   پیا سنگ ناریاں سب سکھ کرتی ہیں

مقصود —

سکھی پت جھار ہوا اب ڈھاک پھولے   مرے بالم نہ اجھوں آکے بھولے

جائسی — "پتے جھڑ گئے اور...... سارا سنسار مل کر پھاگ گا رہا ہے"......

جوہری —

گیا پھاگن چڑھا اب چیت سر پہ   جلی ہوں لی ہماری آگ لے سر

بیان چیت

بکٹ کہانی —

ہے عالم پھولیاں پھلواریاں سب
کریں سیراں پیا سنگ ناریاں سب
لبے ہیں پھول پھولوں سے گلے لاگ
مرے سینے جدائی کا لگا داگ

مقصود —

لادے کا لگا میرا سنگھاتی
چڑھاؤں میں تیرے اب پھول پاتی

پیا اپنے کا درشن آج پاؤں
ترا مستھ پان بھوروں سے چھواؤں

جائسی — "چیت کے ساتھ بسنت رت بھی آگئی،
ہر طرف دھمار ہو رہی ہے .... بالم آم
میں بور آگئے۔"

بکٹ کہانی میں پھاگن میں "دھمال" کرنے کا ذکر ہے اور جائسی کے یہاں ایک ماہ بعد یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ بات مقامی رسم ورواج پر منحصر ہوسکتی ہے۔ راقم سطور کی معلومات کے مطابق پورب کے علاقوں میں اس کا رواج زیادہ تھا چنانچہ گورکھپور میں "دھمال" نام کا ایک محلہ اب بھی مشہور ہے، اگرچہ اب اس فرقہ کے لوگ اس محلہ میں بالکل نہیں ہیں۔

بیان بیساکھ

بکٹ کہانی —

سنو سکھیو کر اب بیساکھ آیا | کوئل نے انبہ پر چڑھ شور لایا
سنی آواز کوئل اور پپیہا | رہے دن رین کیونکر میرا جیا

مقصود —

یہ دن پریت کا نہیں کاٹے کٹت ہے
برہ کا درد نہیں بانٹے بٹت ہے

جائسی — "بیساکھ میں لباس بار اور چندن آگ
معلوم ہوتا ہے ...... دل کا تالاب روز بروز
گھٹتا ہی جاتا ہے۔"

بیساکھ سے گرمی کا موسم شروع ہو جاتا ہے اور اس کی تفصیلات سب جگہ کم وبیش یکساں ہیں، البتہ جائسی نے چیت میں بور آجانے کا ذکر کیا ہے، بکٹ کہانی میں یہ مذکور تو نہیں البتہ بیساکھ سے کوئل کے بولنے کا ذکر ملتا ہے۔ ان تمام نکات پر نگاہ کریں تو قیاس یہی کہتا ہے کہ بکٹ کہانی کسی ایسے مقام پر لکھی گئی جو بہار سے قریب منسوب ہے لیکن لکھنؤ اور جائس سے غالباً مشرق میں واقع ہے۔ بانی پت یا جھنجھانہ یا تھانیسر یا لاہور کا موسم بکٹ کہانی میں مذکورہ موسم سے بہت زیادہ مختلف ہے۔ اس طرح بھی یہ قیاس کہ بکٹ کہانی کا تعلق غازیپور زمانیہ سے ہو زیادہ قرین صحت معلوم ہوتا ہے۔ البتہ کسی قطعی نتیجہ تک پہنچنے کے لئے ابھی تلاش وتحقیق کا سلسلہ جاری رکھنا ہوگا۔

▲

"اردو ادب" کے پرانے فائل

۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۶ء
تک

قیمت: مجلد اکیس روپے فی جلد

انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ

حرمت الاکرام

"یہ روشنی امر ہے"

(اندرا گاندھی کے نام)

درماندہ رہروؤں کا سرمایۂ سفر ہے
لمحوں کے پیچ وخم میں سو طرح جلوہ گر ہے
امروز کی پیامی، فردا کی نامہ بر ہے
یہ روشنی امر ہے

رفتار روز وشب کی اک زرنگار آہٹ
تاریخ کا تبسم کرنوں کی گنگناہٹ
ادراک کی صدا ہے احساس کی نظر ہے
یہ روشنی امر ہے

جاں سوز ظلمتوں کا پندار توڑ دے گی
سینوں میں زندگی کا امرت نچوڑ دے گی
یہ وقت کے افق پر پھوٹی ہوئی سحر ہے
یہ روشنی امر ہے

ماتھے یہ کھائے گی بل، لہرائے گی دلوں میں
نغمہ جرس کا بن کر چلے گی قافلوں میں
تمکین رہبری ہے تقدیر رہگزر ہے
یہ روشنی امر ہے

انجمن کی زیر طبع کتابیں

۱۔ خواجہ میر درد تصوف اور شاعری
از: ڈاکٹر وحید اختر
۲۔ انتخاب کلام علی جواد زیدی
۳۔ انتخاب کلام بلراج کومل
۴۔ انتخاب کلام فراق گورکھپوری (جدید ایڈیشن)
۵۔ اردو صرف ونحو (")
۶۔ مقالات حالی حصہ اول (")
۷۔ انتخاب کلام میر (")
از: ڈاکٹر عبدالحق

انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ

مراسلات

نودریافت دیوانِ غالب کی تاریخِ کتابت

۸ مارچ ۱۹۷۰ء کے "ہماری زبان" میں محمد انصار اللہ صاحب نظر کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ نثار احمد صاحب فاروقی کی بتائی ہوئی تاریخ کتابت ۱۲۳۳ھ (جسے بعد کو انھوں نے خود ہی رد کر دیا) پر کچھ ارشاد فرمائیں۔ نظر صاحب نے ۸ اپریل کے شمارے میں تاریخ کتابت کو ضمنی حیثیت دی ہے۔ اصل مسئلہ نودریافت دیوان کے بخطِ غالب ہونے کا ہی، لیکن اس کی تاریخ کتابت کا تعین بھی کم اہم نہیں۔ صحیح تاریخ کتابت کے علم سے کئی حجاب اٹھیں گے مثلاً اگر یہ طے ہو جائے کہ دیوان مذکور غالب کے بچپن کا لکھا ہوا ہے تو ہم ترقیمے کی عبارت میں غلط عربی جملوں سے صرفِ نظر کر سکتے ہیں، اور یہ مانا جا سکتا ہے کہ بعد میں انھوں نے عربی میں بھی کچھ شُد بُد حاصل کر لی ہوگی اور انھیں عربی میں "نرا جاہل" کہنا ان پر ظلم کرنا ہوگا۔ ویسے ماہرین کے مطابق آخر عمر میں بھی غالب کی عربی دانی مشکوک نظر آتی ہے۔ خود نظر صاحب نے ۲۲ دسمبر ۱۹۶۹ء کے ہماری زبان میں ہجری تاریخوں پر بڑی تفصیل سے بحث کی تھی اور جہاں ایک بڑے پتے کی بات کہی تھی کہ "ہجری تاریخوں کا انحصار رویتِ ہلال پر ہوتا ہے" وہاں یہ قیاس بھی پیش کیا تھا کہ ۴ رجب ۱۲۴۱ھ کو سہ شنبے کا دن ہو سکتا ہے اور "یہ سنہ متنازعہ دیوان کے ترقیمے کے الفاظ سے مطابقت رکھتا ہے۔" اس قیاس میں کئی قباحتیں ہیں۔ ۱۲۴۱ھ مطابق ہے ۱۸۲۵ء کے۔ اس وقت غالب کی عمر ۲۸-۲۹ سال کی تھی۔ ترقیمے کی عبارت شاہد ہے کہ اس کی تحریر کے وقت بیدل مصنف کے ذہن پر اس قدر چھائے ہوئے ہیں کہ دیوان کی تکمیل کے بعد "مضامین دیگر" کے لئے ان کی روح سے رجوع کیا جاتا ہے۔ غالب جیسے نابغہ اور انا پرست کا اس عمر میں یہ جملہ لکھنا سمجھ میں نہیں آتا۔ ویسے یہاں یہ عرض کر دوں کہ ۴ رجب ۱۲۴۱ھ کو نہ از روئے تقویم سہ شنبہ تھا اور نہ از روئے حساب (رویت ہلال)۔ اس کے علاوہ بھی غالب کی پرواز تخیل سے قطع نظر، مذکورہ نسخے میں کچھ ایسے اشعار بلکہ ایسی فنی خامیاں موجود ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مصنف کا فنی مزاج ابھی ناپختہ ہے۔ دو ایک مثالیں عرض کروں گا۔

غالب کی فارسی دانی سے ماہرین کو انکار نہیں اور خود مرزا کو اس پر ناز ہے۔ وہ فارسی زبان سے مناسبتِ طبعی کا دعویٰ کرتے ہیں جس کی بنیاد پر کوئی ہندوستانی فارسی گو ان کی نظر میں نہیں جچتا۔ اب یہ شعر دیکھئے ؎

کو نفس؟ وہ غبار جرأت عجز آشکار — در تپش آباد شوقش ہر سر مو ماتم ہے

(ص ۹۳ شعر ۱ نسخہ عرشی زادہ)

"چہ" فارسی میں محض ایک حرکت ہے جیسے اردو میں کاف بیانیہ "کہ"۔ کم از کم مجھے اساتذہ کے دواوین میں ایسی کوئی مثال نہیں ملی (اس میں خود غالب کا کلیات نظم فارسی بھی شامل ہے) جس میں آغاز یا درمیان مصرعہ میں "چہ" کو "چے" باندھا گیا ہو۔ مصرعے کے آخر میں ممکن ہے اس کی اجازت ہو۔

"نہ" کو ضرورتِ شعری کے سبب قدما "نے" باندھ لیتے تھے ورنہ "نہ" بھی "چہ" ہی کی طرح ایک حرکت ہے۔ اور "نہ" لکھ کر "نے" پڑھنا بھی درست نہیں۔ جتنے مخطوطے میں نے دیکھے ہیں ان میں اس کی کوئی مثال میری نظر سے نہیں گزری۔ اب مرزا کے یہ دو مصرعے ملاحظہ ہوں۔

؎ نہ زبانِ غنچہ گویا نہ زبانِ خار باغ

(ص ۲۹ شعر ۱ نسخہ عرشی زادہ)

؎ نے صبا بال پری نہ شعلہ جوز عافیت

(ص ۴۷ شعر ۱ نسخہ عرشی زادہ)

یہ دونوں مصرعے بحر رمل میں ہیں۔ ابتدا میں "فاعلاتن" کو "فعلاتن" باندھنا روا رکھا گیا ہے لیکن درمیان مصرعہ نہیں۔ دوسرے مصرعے سے یہ دلیل بھی بے وقعت ہو جاتی ہے کہ "نہ" لکھ کر "نے" پڑھا جاتا ہوگا۔ اگر ایسا ہوتا تو مصرعے کے شروع میں "نے" لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مصرعے ثبوت ہیں اس امر کا کہ ان کے مصنف کا مزاج شعر ابھی پختہ نہیں ہوا۔ یہ تسلیم کہ غالب عروض داں نہ تھے لیکن اس معمولی سی بات کے لئے عروض دانی ضروری نہیں۔ کوئی بھی موزوں طبع "نہ" اور "نے" میں تمیز کر سکتا ہے۔ چنانچہ میرا خیال یہ ہے کہ مندرجہ مصارع اس وقت کہے گئے جب غالب پختگی کی منزل میں داخل نہیں ہوئے تھے۔

اب سنہ کتابت کی طرف آئیے۔ میں نے اوپر نظر صاحب کے قول کا حوالہ دیا ہے کہ ہجری تاریخوں کا انحصار رویت ہلال پر ہے رویت ہلال کی رو سے ۴ رجب کو منگل کا دن (غالب کے سن شعور کو پہنچنے یا آغاز شعر گوئی کے بعد) دو برسوں میں پڑتا ہے ۱۲۲۸ھ اور ۱۲۳۶ھ۔ (یہاں نظر صاحب سے معذرت کے ساتھ یہ عرض کر دوں کہ ڈیڑھ سو برس کے بعد بھی رویت ہلال کا تعین ممکن ہے)۔ فی الحال ۱۲۳۶ھ کو قبول کرنے میں خود حل طلب والی یادداشت ۱۲۳۵ھ مانع ہے۔ ۱۲۲۸ھ کے حق میں اور خلاف بہت سے دلائل پیش کئے جا سکتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے ایک مراسلہ ہماری زبان کے لئے لکھا تھا لیکن وہ مضمون ہو گیا۔ اس کی طوالت کے پیش نظر گمان ہوا کہ ممکن ہے ہماری زبان کی ایک ہی اشاعت میں اس کے لئے مطلوبہ صفحات وقف نہ کئے جا سکیں اس لئے مضمون "آج کل" نئی دلی کو بھیج دیا گیا جو ماہ جون کی اشاعت میں شامل ہوگا۔

عابد پشاوری
جموں یونیورسٹی

انیس کی صد سالہ برسی

غالب صدی کے بعد میر انیس صدی بھی نزدیک آ پہنچی ہے۔ اردو کے سب سے بڑے ماہر انیسیات پروفیسر سید مسعود حسن رضوی کے دولت خانہ "ادبستان" لکھنؤ میں میر انیس صد سالہ تقریبات کمیٹی قائم ہے جس نے دسمبر ۱۹۷۱ء میں میر انیس صدی منانے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس کے کچھ بعد دلّی میں مرکزی انیس صدی کمیٹی قائم کی گئی۔ اس کے جنرل سکریٹری علی جواد مسعود صاحب ہیں۔ سکریٹری مالک رام صاحب اور سید علی جواد زیدی صاحب ہیں۔ ایسا یاد پڑتا ہے جیسے یہ کمیٹی ۱۹۷۴ء میں انیس تقریبات کرنا چاہتی ہے۔ مجھے اس سلسلے میں دو التماس کرنے ہیں۔

۱۔ کیا اچھا ہو اگر کل ہند سطح پر صرف ایک کمیٹی ہو یعنی کسی طرح دونوں کمیٹیوں کا انضمام ہو جائے۔

۲۔ مروج انیس کے مطابق انیس کی تاریخ وفات ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ یعنی ۱۰ دسمبر ۱۸۷۴ء ہے۔ شوال ۱۳۹۱ھ دسمبر ۱۹۷۱ء کے مطابق ہے۔ لکھنؤ کی کمیٹی ہجری کلنڈر کے حساب سے دسمبر ۱۹۷۱ء میں یہ تقریبات منعقد کرنا چاہتی ہے۔ میری نہایت ناقص رائے میں اس کا جواز نہیں۔ اس سے یہ غلط فہمی رائج ہو جائے گی کہ میر انیس کا انتقال دسمبر ۱۸۷۱ء میں ہوا تھا۔ کوئی محقق نہیں چاہے گا کہ وہ اس قسم کی غلط فہمی قائم کرنے کا موجب بنے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں عام طور سے عیسوی سنہ رائج ہو گیا تھا۔ غالب کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست رام پور سے بھی انھیں عیسوی مہینے ہی کے اعتبار سے مشاہرہ ملا کرتا تھا۔ انیس کے انتقال کے بعد زمین سورج کے گرد سو بار طواف دسمبر ۱۹۷۴ء ہی میں مکمل کرے گی اور وفات انیس کے بعد سو بار گرمیاں اور سردیاں دسمبر ۱۹۷۴ء ہی تک آئی ہوں گی۔ دسمبر ۱۹۷۱ء تک تو محض ۹۷ بار ہی بہار و خزاں آئی ہوں گی۔ انیس صدی دسمبر ۱۹۷۴ء میں منانی چاہیے اس طرح ان کے شایان شان کچھ کتابیں تیار کرنے کی مہلت بھی مل جائے گی۔

جموں۔ • گیان چند

غالب کی نئی غزلوں کی صحیح تعداد

شمار کی فروگزاشتوں اور کتابت کی غلطیوں پر نظر ثانی کے بعد بعض محققین کے نزدیک نسخہ بھوپال بخط غالب کی ان مکمل غزلوں کی تعداد جو نسخہ حمیدیہ میں نہیں ہیں ۲۵ قرار پائی ہے لیکن یہ تعداد اب بھی صحیح نہیں ہے۔ بظاہر ان محققین نے اس غزل کو بھی اپنی فہرست میں درج کر لیا ہے جس کا مطلع ہے۔

آنکھوں میں انتظار سے جاں پر شتاب ہے
آتا ہے آ وگرنہ یہ پا در رکاب ہے

لیکن اس غزل کا مندرجہ ذیل شعر نسخہ حمیدیہ میں اس فرق کے ساتھ موجود ہے کہ دوسرے مصرعے میں "سرشک" کی جگہ "سواشک" ہے۔

ظاہر ہے طرز قید سے صیاد کی غرض
جو دانہ دام میں ہے سرشک کباب ہے

اس سے واضح ہے کہ نسخہ حمیدیہ میں یہ غزل ترمیم شدہ شکل میں شامل ہے اور اس کو ایسی مکمل غزلوں میں شمار کرنا غلط ہے جو نسخہ حمیدیہ میں نہیں ہیں اس طرح اس زمرے کی غزلوں کی صحیح تعداد ۲۴ ہے۔

نسخہ بھوپال بخط غالب کی جو غزلیں نسخہ حمیدیہ میں نہیں ہیں وہ غالب کے کسی اور معلوم دیوان میں بھی نہیں ہیں۔ راقم الحروف نے فروری ماخذ سے مقابلہ کر کے اپنے مضمون "نسخہ بھوپال بخط غالب پر ایک نظر" (شاعر، جولائی ۱۹۷۰ء) میں نشاندہی کی تھی کہ ایسی مکمل غزلوں کی کل تعداد ۲۴ ہے نیز یہ کہ ان غزلوں میں سے ایک مطبوعہ غزل ـ دم چند رہا، غم چند رہا۔ کو خارج کرنے کے بعد نئی غزلوں کی کل تعداد ۲۳ قرار پاتی ہے۔ موجودہ معلومات کی حد تک اگر یہی اعداد و شمار صحیح ہیں تو انھیں قبول کر لینے میں کیا تامل ہے؟

بھوپال۔ • ابو محمد سحر

استفسار

ہماری زبان کے پڑھنے والوں سے یہ گزارش ہے کہ براہ مہربانی حسب ذیل امور مشورہ طلب کی تحقیق فرما کر براہ راست یا بذریعہ ہماری زبان مدد کریں۔

۱۔ بم پھوٹی کہاں سے ہماری زبان میں آیا۔ امیر مینائی اور ریاض خیرآبادی دونوں نے نظم کیا ہے۔؟ ؎

دل دیا میں نے تو بولے کہیں بم پھوٹی ہے
دل ہی دل روز چلے آتی ہیں صفاتوں میں

ریاض ؎ یہ کہکشاں ہے کہ بام فلک سے بم پھوٹی
لپک یہ آگ کی ہے یا شفق کا ہے دامن

۲۔ تجال، کیک، بسکٹ، پکلانہ کرارو ہے کی بھجّی کہاں سے آیا؟ بظاہر اس کا سن پچیس سال ہے۔

۳۔ چلکارے کے کیا معنی ہیں (یادگار داغ) ؎

تری محفل سے میں یہ جا کے لایا کہ چلکارے سے لے مجھ کو وہاں سے؟

۴۔ بلّی کس زبان کا لفظ ہے؟

۵۔ خلفشار کی ترکیب کیا ہے؟

۶۔ کاہلا۔ کو مستشرقین نے عربی کاہل سے لیا ہے یہ غلط معلوم ہوتا ہے (انیس)

آہ جو کاہلے تھے تو جیتے تھے سیاہ فام۔ پتھر کی کیل کے رہ گئے تھے مثل موم خام۔

ہندی کی تو اس کا ماخذ نہیں ہے؟ • طاہر حسن۔ لکھنؤ

اخبار و اذکار

مگدھ یونیورسٹی سے محبان اردو کا مطالبہ

آرہ (بہار)۔ جناب نسیم محمد جان کی قیام گاہ پر آرہ شہر کے ادیبوں اور شاعروں کی ایک ہنگامی نشست زیر صدارت جناب مولانا آمانی ندوی صاحب مگدھ یونیورسٹی کے غیر ذمہ دارانہ عمل کی مذمت کرنے کے لئے ہوئی جس میں مندرجہ ذیل تجاویز بالاتفاق آرا منظور کی گئیں۔

تجویز نمبر ۱:۔ ادیبوں اور شاعروں کا یہ جلسہ وائس چانسلر مگدھ یونیورسٹی کے اس غیر ذمہ دارانہ رویہ پر اپنے بڑے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے کہ آج سے چند ماہ بیشتر وائس چانسلرس کی میٹنگ میں غیر ہندی داں طلبہ کو اپنی مادری زبان میں جوابات لکھنے کی اجازت دی گئی تھی لیکن اب تک وائس چانسلر نے اس کا باقاعدہ سرکلر کالجوں میں نہیں بھیجا، نہ وہ سرکلر اب تک واپس لیا جس کی رو سے تمام طلبہ کو صرف ہندی میں لکھنے پر مجبور کیا گیا تھا، امتحانات قریب ہیں اور طلبہ میں سخت بے چینی کی لہر دوڑی ہوئی ہے اور وہ ایک خطرناک دوراہے پر کھڑے ہوئے ہیں۔

لہٰذا یہ جلسہ وائس چانسلر سے پر زور اپیل کرتا ہے کہ وہ جلد از جلد مذکورہ بالا سرکلر اپنے کالجوں میں بھیج کر طلبہ کو اپنی مادری زبانوں میں جوابات لکھنے کی اجازت دیں۔ اس لئے کہ یہ ان کا آئینی حق ہے۔

تجویز نمبر ۲:۔ یہ جلسہ تمام غیر ہندی داں طلبہ سے اپیل کرتا ہے کہ یونیورسٹی کے امتحانات میں غیر لسانی پرچوں کے جوابات اپنی ہی زبانوں میں لکھیں، اس لئے کہ دستور ہند نے ان کو یہ حق دیا ہے۔ • قومی آواز

میر انیس کے صد سالہ یوم وفات پر شایان شان تقریبات

اردو کے عظیم شاعر اور سب سے بڑے مرثیہ گو میر ببر علی انیس کے سویں یوم وفات کے موقع پر لکھنؤ میں ان کی عظمت کے شایان شان سنجیدہ علمی و ادبی تقاریب منعقد کرنے کی تیاریاں شروع ہو گئی ہیں۔

یہ تقاریب میر انیس یادگار کمیٹی کی طرف سے دسمبر ۱۹۷۳ء میں منعقد ہوں گی جبکہ ہجری کلنڈر کے اعتبار سے ان کی وفات کو ۱۰۰ سال پورے ہو جائیں گے کمیٹی نے اس سلسلے میں ایک انیس صد سالہ تقریبات کمیٹی کی تشکیل کر دی ہے جس کے کنوینر ڈاکٹر نیر مسعود ہیں۔

ایک کل ہند میر انیس تقریبات کمیٹی بھی دہلی میں قائم کر دی گئی ہے جو ۱۹۷۴ء میں کل ہند پیمانے پر تقریبات منعقد کرے گی جبکہ عیسوی کلنڈر کے اعتبار سے وفات کے ۱۰۰ سال پورے ہوں گے۔

مرکزی کمیٹی کے عہدیداروں میں ڈاکٹر سید برہان الدین (سرپرست)، گورنر بمبئی نواب علی یاور جنگ (صدر)، پنڈت ہردے ناتھ کنزرو (چیرمین)، پرنس معظم جاہ اور ڈاکٹر سید یوسف نجم الدین (نائب صدر)

سید مسعود حسن رضوی (جنرل سکریٹری) اور جناب مالک رام اور سید علی جواد زیدی (سکریٹری) شامل ہیں۔ • قومی آواز

تلنگانہ اسٹیٹ میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا وعدہ

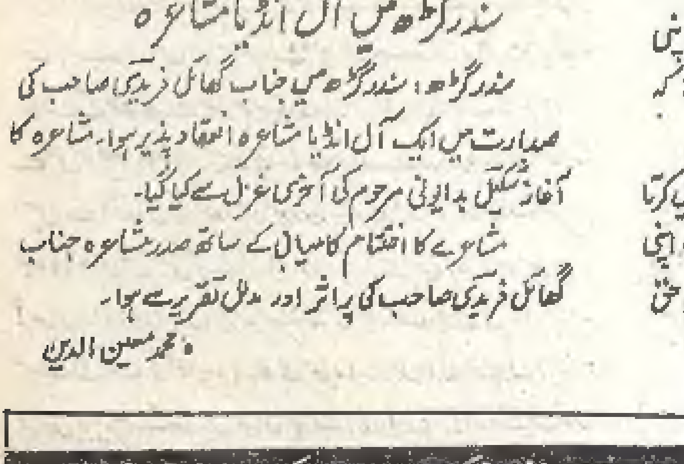
حیدرآباد:۔ صدر تنظیم تلنگانہ پرجا سمیتی ڈاکٹر ایم چنا ریڈی نے ڈیوڑھی کمال یار جنگ میں سربرآوردہ شہریوں کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تلنگانہ اسٹیٹ بن جائے تو اس میں لسانی اور مذہبی اقلیتوں سے مکمل انصاف ہوگا اور اردو کو ریاست کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے گا۔ • الجمعیۃ

سندر گڑھ میں آل انڈیا مشاعرہ

سندر گڑھ: سندر گڑھ میں جناب گھائل فریدی صاحب کی صدارت میں ایک آل انڈیا مشاعرہ انعقاد پذیر ہوا۔ مشاعرہ کا آغاز شکیل بدایونی مرحوم کی آخری غزل سے کیا گیا۔

مشاعرے کا اختتام کامیابی کے ساتھ صدر مشاعرہ جناب گھائل فریدی صاحب کی پر اثر اور مدلل تقریر سے ہوا۔

• محمد معین الدین



گورکھپور میں علامہ اختر تلہری کا سوگ

مورخہ ۲۲ اپریل ۱۹۸۱ء کو حلقۂ ادب، گورکھپور کا ایک تعزیتی جلسہ جناب نور گورکھپوری کی قیام گاہ پر علامہ سید اختر علی تلہری کے سوگ میں منعقد ہوا۔ اس جلسہ کی صدارت ڈاکٹر سلام سندیلوی نے فرمائی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں علامہ اختر تلہری کو زبردست خراج تحسین پیش کیا اور کہا کہ ان کی وفات سے اردو شاعری اور اردو تنقید کو سخت صدمہ پہنچا ہے۔ اختر علی تلہری عربی و فارسی کے زبردست عالم تھے یہی وجہ ہے کہ ان کو اردو زبان پر عبور حاصل تھا۔ ان کی ہمہ دانی ان کی تنقید میں نمایاں طور پر جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے "محاسبے" ان کے تنقیدی شعور پر بخوبی روشنی ڈالتے ہیں۔

اس جلسہ میں شمس الآفاق صاحب اور نور گورکھپوری صاحب نے بھی علامہ مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا اور ان کی وفات کو ناقابل تلافی نقصان قرار دیا۔ آخر میں شرکائے جلسہ نے ایک تعزیتی تجویز منظور کی۔ • غبار وارثی

پروفیسر سروری کے انتقال پر اردو رائٹرس ایسوسی ایشن کلکتہ کا تعزیتی جلسہ

پروفیسر عبد القادر سروری مرحوم کے انتقال پر اردو رائٹرس ایسوسی ایشن کلکتہ کا تعزیتی جلسہ منعقد ہوا۔ قرار داد تعزیت میں مرحوم کے انتقال کو ایک سانحہ اور ناقابل تلافی نقصان بتایا گیا۔

ایم۔ اے نصر

حیدر آباد میں کاوش بدری کا خیر مقدم

۲۰ اپریل ۱۹۸۱ء کو حیدر آباد میں شہزادہ نقی علی خاں ثاقب (نبیرۂ آصف جاہ میر عثمان علی خاں خلد مکاں) کے دولت کدہ "زر افشاں" پر ایک محفلِ شعر جناب کاوش بدری صاحب کے اعزاز میں ادارہ برگ آوارہ کے زیر اہتمام ترتیب دی گئی مدیر برگ آوارہ جناب محمود خاور صاحب نے کاوش بدری صاحب کا تعارف کرایا۔ نشست میں کئی نامور ممتاز شعرا سریندر اس ملا ہوتی اور یوسف نواب اور دوسرے ممتاز افراد بھی شریک تھے۔

• این۔ ایم جیلانی ایم اے

ڈاکٹر سلام سندیلوی کو ان کی کتاب "اردو شاعری میں نرگسیت" پر خراج تحسین

گورکھپور۔ "نئے زاویے" کی ایک نشست ڈاکٹر سلام سندیلوی کی قیام گاہ پر ڈاکٹر صاحب موصوف کی صدارت میں ہوئی۔ اس نشست میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے ابرار اعظمی نے شرکت کی۔ نشست کا آغاز کرتے ہوئے ایم کوٹھیاوی راہی نے ڈاکٹر سلام کی زیر طبع کتاب "اردو شاعری میں نرگسیت" کا ذکر کیا جس کا پہلا باب "نرگسیت کا مفہوم" ڈاکٹر صاحب نے سنایا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ابرار اعظمی نے کہا کہ اس موضوع پر نہ صرف اردو میں بلکہ ہندی اور انگریزی میں بھی باقاعدہ طور پر کوئی کام نہیں ہو سکا ہے۔ ایم کوٹھیاوی راہی نے اسے اردو ادب میں ایک کامیاب اضافہ بتاتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کو مبارکباد پیش کی۔ نثری دور کے بعد شعری دور کا آغاز ہوا۔ ممتاز و نامور شعرائے کرام نے اپنا کلام سنایا۔

آخر میں علامہ اختر علی تلہری کی وفات پر ایک تعزیتی تجویز کے ذریعہ مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کی گئی۔

• جمیش اشک گورکھپور

انجمن ترقی اردو کے وفد کی ڈائرکٹر مردم شماری سے ملاقات

لکھنؤ۔ ریاست میں مردم شماری عملے نے خانہ ۱۳ میں زبان اردو لکھوانے والوں کی خواہش کے برخلاف عام طور پر ہندی لکھدی ہے اور جہاں اردو کے حامیوں نے اس دھاندلی کی شکایت کی اور اردو درج کرانے پر اصرار کیا ان پر تعزیرات ہند کی دفعات کے تحت مقدمہ قائم کر دیا گیا۔

یہ بات ڈائرکٹر مردم شماری جناب ڈی۔ ایم۔ سنہا اور ریاستی حکومت کے جوائنٹ سکریٹری جناب ان راجہ گوپال (انجمن ترقی اردو (ہند) کے دو رکنی وفد نے جو بیگم سلطانہ حیات انچارج کل ہند مردم شماری مہم اور جناب راحت علی خاں آنریری جنرل سکریٹری ریاستی انجمن ترقی اردو اترپردیش پر مشتمل تھا) بھی اور ان پر زور دیا کہ وہ ان شکایتوں کی اپنے ذرائع سے جانچ کرائیں اور اردو کے ساتھ مبینہ حق تلفی کا ازالہ کریں۔

بیگم سلطانہ حیات نے ریاست بھر سے آئے ہوئے سیکڑوں کی تعداد میں شکایتی خطوط کو ان افسروں کو دکھایا اور ان کے اقتباس بھی پڑھ کر سنائے جس سے ان واقعات کی نشاندہی ہوتی ہے۔

مردم شماری کے ڈائرکٹر اور ریاستی جوائنٹ سکریٹری نے وفد کی باتوں کو توجہ سے سنا اور جلد ہی اس پر مناسب کارروائی کرنے کا وعدہ کیا۔

ڈائرکٹر صاحب مردم شماری نے ضلع کی سطح پر پہونچائی جانچ رپورٹوں کی کاپیاں بھی انچارج کل ہند مردم شماری بیگم سلطانہ حیات صاحبہ کو دی تھیں۔

• راحت علی جنرل سکریٹری

تبصرہ

ڈاکٹر ناصر حسین نقوی

• دیوانِ شاغل
• شاغل عثمانی مرحوم

ابھی کل کی بات ہے مولانا احترام الدین شاغل کی ذات ہندوستان بالخصوص راجستھان میں اردو کی ترویج و ترقی کا ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ لیکن اب ان کا جسدِ خاکی ہمارے درمیان نہیں رہا، صرف ان کے وہ کام رہ گئے جو انھوں نے اردو کی ترویج و ترقی کے لئے کئے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کے عملی کاموں کے علاوہ علمی کام بھی ہیں جو اردو والوں کو ان کی یاد مدتوں تک دلاتے رہیں گے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی دیوانِ شاغل جلد اوّل ہے، جس پر ہم آج اظہارِ رائے کر رہے ہیں۔

شاغل صاحب کی شاعری کو سمجھنے کے لئے رشید احمد صدیقی صاحب کا یہ معنی خیز جملہ بہت مفید ثابت ہوگا۔ "انھوں نے شاعری کو اتنا نفس کا نہیں جتنا اخلاق کا تقاضا سمجھا۔"

شاغل صاحب کے دیوان کی غزلوں پر غزلیں پڑھتے جایئے آپ کو ان کے بیشتر اشعار میں یہی خصوصیت ملے گی جس کا ذکر رشید احمد صاحب نے کیا ہے۔ اب یہاں سے ایک دوسری بحث چھڑ سکتی ہے کہ شاعری اور اخلاق کا رشتہ کیا ہے؟ اور کیوں ہے؟ زیرِ نظر تبصرہ میں اس بحث کو چھیڑنے کی چنداں ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ تاہم رشید احمد صدیقی ہی کے الفاظ میں یہ ضرور کہنا پڑے گا کہ

> "عاشقی کی طرح شاعری میں بھی کچھ نہ کچھ کہیں نہ کہیں انحراف ضرور ہوتا ہے، اس سے کردار اور کلام دونوں میں انفرادیت آتی ہے۔"

جہاں تک انحراف کا سوال ہے شاغل صاحب کی شاعری اس سے عاری ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ہمارے ناقدین جس وصف کو انفرادیت کا نام دیتے ہیں وہ زیرِ تبصرہ مجموعہ کلام میں نہیں ملتی۔

شاغل صاحب کی شاعری نے جب آنکھیں کھولیں تو اس وقت کی فضا میں داغ اور جلال کے نغمے گونج رہے تھے اور نوح، سائل، بیخود، ریاض اور جلیل کی شاعری ایک عالم کو مسحور کر رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ شاغل صاحب بھی ان نغمات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے ہوں گے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ شاغل صاحب نے مذکورہ اساتذہ سے زبان کا انداز سیکھا لیکن اس تقاضے کو مدنظر رکھا جس کا ذکر رشید احمد صدیقی صاحب نے کیا ہے۔ اسی لئے ان کی شاعری سیدھی سادی، صاف ستھری زبان کی حامل بن گئی جس کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے ہو سکے گا۔

دہی دن تھے کچھ اچھے اور وہی اچھا زمانہ تھا
قدم تھا گلستاں میرا عدم تھا آشیاں میرا

نازک مزاج مجھ سا ملا تو ملا حباب
موجِ ہوا سے شیشۂ دل چور چور تھا

ہر اک نفس نفس نہیں بانگِ رحیل ہے
اہلِ خرد کے واسطے بانگِ درا ہے کیا؟

اے ناشناسِ ہیبتِ انساں ذرا سمجھ
دل کی بساط دیکھ، غمِ روزگار دیکھ

کس قدر آگے بڑھے ہیں ہمرہانِ تیز گام
چرخ سے آگے بھی گردِ کارواں ملتی رہی

یہ اشعار ان کی شریف النفسی کو سمجھنے کے لئے کافی ہوں گے۔

اس مجموعہ کلام کی کتابت، طباعت اور کاغذ اوسط درجہ کا ہے اور قیمت تین روپیہ پچاس پیسے ہے جو محمد احتشام الدین، عثمان لگ، گیٹ، تسلیم منزل، بیجا پور سے مل سکتی ہے۔

•

کتابیں ملیں

۱۔ فارسی ادب بعہد اورنگ زیب
مصنف: ڈاکٹر نور الحسن انصاری
ناشر: انڈو پرشین سوسائٹی

۲۔ پیکرِ خیال
مصنف: اختر بستوی
ناشر: مکتبہ دنیوا ادب دلی لاٹوش روڈ لکھنؤ ۱۸
قیمت: دو روپے

۳۔ یاد کی خوشبو
مرتب: محمود خاور
ناشر: شالیمار پبلیکیشنز ۲۸۷ ملک پیٹ جدید حیدر آباد ۳۶
قیمت: تین روپے

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ پرنٹر و پبلشر سید تفضل حسین ایم اے نے لیتھو کلر پریس علی گڑھ میں چھپوایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا
REGD. NO. L-922 فون نمبر ۲۹ R-NO. 2186/57